DIWAN -I- GHALIB

دیوانِ غالب

یعنی مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی مرحوم و مغفور کے مشہور
اُردو دیوان کا پاکٹ اڈیشن

مُرتّبہ

خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے بیرسٹر ایٹ لا

قیمت مجلد (جس میں غالب کی تصویر ہے) ۔۔ ۸عہ

" بلا تصویر ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۱۴عہ

باہتمام شیخ گلزار محمد پرنٹر
گلزار محمدی سٹیم پریس لاہور میں چھپوایا

عطیہ برائے سردار حفیظ محمد جعفر بریجی

محمد اقبال قریشی

۱۳-۸-۹۶

۷۸۶

دیباچہ

مدت سے آرزو تھی۔ کہ دیوان غالب کا ایک خوش قلم نسخہ
عمدہ و درستی کاغذ کی کسی موزوں تقطیع پر شائع کیا جائے جسے
کلام غالب کے دلدادہ شوق سے اپنے پاس رکھیں اور پڑھیں
کئی برس ہوئے جب میں دہلی میں تھا تو میں نے بازار سے
ایک معمولی نسخہ دیوان غالب کا لیا۔ اس میں کتابت کی
بہت سی غلطیاں تھیں۔ حتی المقدور ان کی تصحیح کی۔ یہ
درست کردہ نسخہ علیگڈھ میں منشی علی محمد صاحب مرحوم مغفور کی
کو کتابت کے لئے بھیج دیا۔ اور ان سے یہ خواہش کی کہ اس

اسے علیگڈھ ہی میں چھپوائیں نصف سے زیادہ حصہ وہاں چھپ چکا
تھا کہ بعض ایسے موانع پیش آئے جن کے سبب آئندہ کتابت
اور چھپائی رک گئی۔ انتظار کے بعد تیار شدہ حصہ ان سے منگوا لیا
خیال تھا کہ باقی حصہ دہلی میں تیار کرا لینگے۔ مگر اتنے میں گردش آب
و دانہ مجھے دہلی سے لاہور لے آئی۔ لاہور میں ابھی اس کتاب کی
چھپائی کی طرف متوجہ ہونیکا موقع نہیں ملا تھا کہ میں لائل پور میں سرکاری
وکیل مقرر ہو گیا اور یہاں چلا آیا۔ یہاں کی آب و ہوا علمی و ادبی کاموں
اشاعت کتب کے لئے کچھ بہت موافق نہیں۔ دیوان غالب اسی طرح
ادھورا پڑا رہا حال میں میرے عزیز شیخ عبداللطیف صاحب المتخلص بہ تپش
کی نظر دیوان کے نامکمل اجزا پر پڑی۔ عزیز موصوف ادب اردو
[illegible] انہوں نے اصرار کیا۔ کہ دیوان کے باقی حصے کو لکھوا
[illegible] شائع کیا جائے اور باقی حصے کی
[illegible] کی نگرانی انہوں نے اپنے ذمہ لی اس طرح اتنی

دیر بعد یہ اڈیشن نکلتا ہے - افسوس کہ اڈیشن جسے میں قابل رشک بنانا چاہتا تھا۔ پیوند کا داغ لیکر نکلا۔ پہلے حصے کی کتابت اور تھی۔ پچھلے حصے کی اور ہے۔ کاغذ اب بھی قیمتی اور عمدہ لگایا گیا ہے۔ مگر جو کاغذ چند سال پہلے لگتا تھا۔ وہ اب بازار میں موجود ہی نہیں۔ چھپائی علیگڈھ کی اور ہے۔ لاہور کی اور۔ مگر اس وقت ان عیوب کا علاج ناممکن تھا۔ پھر بھی کچھ باتیں اس نسخہ میں ایسی ملینگی جو پہلے نسخوں میں نہیں ہیں۔ ناظرین اس کے نقصوں سے جو مجبوراً واقع ہوئے ہیں درگذر فرمادیں۔ اگر دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئی تو وہ انشاءاللہ نظر فریب ہوگا*

اِس دیوان کو ایک چیز ایسی دستیاب ہوئی ہے جو پہلے کسی نسخہ کو میسر نہیں یعنی مرزا غالب مرحوم و مغفور کی ایک صحیح اور مستند عکسی تصویر زیب ورق اول ہے جس

تصویر کے لئے میں اپنے ذی علم دوست لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے دہلوی مؤلف "خمخانۂ جاوید" کا ممنون ہوں۔ ان کے عم بزرگوار رائے بہادر پیارے لال صاحب سرگباش انسپکٹر مدارس مرزا غالب مرحوم کے عزیز ترین دوستوں اور مداحوں میں تھے یہ عکسی تصویر رائے صاحب ممدوح کو میرزا صاحب مرحوم نے دی تھی اور رائے صاحب سے بطور ایک قابل قدر یادگار کے لالہ سری رام صاحب کے پاس پہنچی تھی۔ اس تصویر سے ہاف ٹون تصویریں اس نسخہ کے لئے تیار کی گئی ہیں ؎

بعض احباب کا خیال تھا۔ کہ دیوان غالب مع شرح شائع کیا جائے مگر میں نے معرا نسخہ کو ترجیح دی ہے جن ملکوں میں ادب اور ادیبوں کی قدر ہے۔ وہاں شرحوں کے علاوہ ہر مقبول مصنف کی ایک ایک کتاب کے کئی کئی

نسخے معرّا طبع ہوتے ہیں۔ ایک سے ایک تکلف اور نفاست میں بڑھا ہوا۔ قیمتیں خواہ کتنی زیادہ ہوں۔ ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے ترقی اور ایسی قدردانی کا ابھی آغاز ہے۔ رفتہ رفتہ شاید یہاں بھی وہی رنگ پیدا ہو جائے۔ پہلی ضرورت یہ ہے۔ کہ مشہور شعرا اور نثر نگاروں کی تصانیف ایسے لباس میں شائع ہوں۔ جن سے اردو کتابوں کے کتب خانے مرتب ہو سکیں۔ جو ترقی یافتہ زبانوں کے ذخائر ادب سے کچھ نسبت رکھیں۔ اس کے بعد جن کتابوں کی شرحوں کی ضرورت ہو ان کی شرحیں لکھی جائیں۔ دیوان غالب کی دو تین شرحیں اس سے پہلے لکھی گئی اور شائع ہو چکی ہیں۔ مگر ایسی کتابوں کی مزید شرح کی ہمیشہ گنجائش رہیگی۔ اس ایڈیشن کا مقصد تو فقط یہی ہے۔ کہ شائقین کے ہاتھوں

ہیں دیوان غالب کا ایک نسخہ معمولی نسخوں سے کچھ بہتر
موجود ہو۔

لائل پور
۸ر جنوری ۱۹۱۹ء

عبد القادر

غالبؔ دہلوی

ہندوستان کی علمی دنیا میں غالب کا نام کئی حیثیتوں سے مشہور ہے اور رہیگا۔ ہندوستان نے فارسی نظم و نثر کے جو استاد پیدا کئے۔ ان میں غالب کا پایہ نہایت بلند ہے۔ مگر ہمیں اس وقت مرزا غالب مرحوم کے اس کمال سے بحث ہے۔ جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری دور میں اردو شاعری میں دکھایا۔ ان کی اردو نثر بھی لاجواب تھی۔ بلکہ ایک معنی میں وہ نثر کی جدید طرز انشاء کے بانی تھے۔ لیکن ان کے کمال نثر پر بحث کرنے کا یہ محل نہیں ہے اس وقت تو ان کی اردو شاعری سے سروکار ہے مرزا صاحب

مرحوم نے اپنی ساری عمر فارسی شاعری میں صرف کی۔
اور اسی پر انہیں فخر و ناز تھا۔ انیسویں صدی عیسوی
کے آخری نصف میں اردو شاعری کا چرچا بڑھا۔ بہادر شاہ
مرحوم خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار خود اچھے سخنور اور
اہل سخن کے قدردان تھے۔ ان کے زمانے میں دہلی میں
بہت سے نامور شاعر ابھرے ان میں مومن و ذوق کے
اردو دیوان زیادہ متداول ہیں۔ اور خاص طور پر مقبول عام
ہوئے ہیں۔ مرزا غالب طباعی میں اپنے کسی ہم عصر سے کم
نہ تھے۔ وہ بھی زمانے کی ہوا بدلتی دیکھ کر ریختہ کی طرف
مائل ہوئے۔ فارسی میں غالبؔ تخلص کرتے تھے۔
اردو کے لئے اپنے نام کی مناسبت سے اسدؔ تخلص اختیار
کیا۔ پہلے کچھ دنوں فارسیت کے زور سے اردو میں بھی
شاعری کرتے رہے مگر صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ فارسی

اشعار کی صورت بدل دی ہے۔ کہیں قافیہ یا ردیف میں ایک آدھ لفظ اردو کا آگیا اور باقی الفاظ اور بندش اور ترکیب سب فارسی مگر تھوڑے دنوں میں زور طبیعت رنگ لایا۔ فارسی ترکیبیں کہیں کہیں پرلطف پیرایہ میں آنے لگیں اور ان کے کلام کا ایک دلفریب حصہ بن گئیں۔ اور اردو منجھ کر ایسی صاف اور سلیس ہو گئی۔ کہ جو غزلیں سلاست کا جوہر رکھتی ہیں۔ وہ اس خوبی میں کہنہ مشق ریختہ گو شعرا سے گوئے سبقت لے گئیں۔ اس زمانے میں اردو میں بھی غالب تخلص کرنے لگے۔ کلام میں گداز پیدا ہو گیا۔ اور خیالات کی غیر معمولی بلندی اور جدت طرازی نے ان کی اردو شاعری کا پایہ دنوں میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ان کا اردو کلام بہ مقابلہ فارسی کلام کے بہت ہی کم ہے۔ اس مجموعے کو دیکھئے۔ اور غالب نام آور کے نام کو دیکھئے۔ مقدار کے اعتبار

سے یہ مجموعہ نظر میں نہیں جچتا۔ مگر عالی خیالی اور ایجاد مضامین ومطالب نے اس کی قیمت ایسی بڑھائی۔ کہ ان کے جیتے جی ان کی اردو شاعری کے معترف ہر طرف پیدا ہو گئے۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کے مداحوں کی تعداد روز افزوں ہے۔ اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائیگا اور لوگوں میں شاعری کی اصلی خوبیوں کی شناخت کی قابلیت ترقی کرتی جائیگی۔ غالب کی قدر دانی بڑھتی جائیگی۔ آئندہ زمانے میں بہت جستجو ہوگی کہ یہ عالی دماغ شخص کون تھا۔ کس گھرانے سے تھا۔ کہاں اس نے تعلیم وتربیت پائی تھی۔ اُس کے گرد وپیش کیا سامان تھے۔ جن سے اس کی طبیعت کے جوہر اصلی نے جلا پائی۔ کیا سوانح اسے پیش آئے۔ کون سے واقعات ہیں جن کی طرف اس کے کلام میں جابجا اشارات ہیں۔ ہمارے مُلک میں بدقسمتی سے ان معلومات کا ذخیرہ مشاہیر کے

متعلق بھی کمیاب ہوتا ہے۔ اور غالب کے متعلق بھی تھوڑا ہی ہے۔ گو اب تک وہ لوگ موجود ہیں۔ جنھوں نے غالب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ خدا بھلا کرے مولنا حالی مرحوم کا کہ جو معلومات بہم پہنچ سکی ہیں۔ وہ اپنی کتاب یادگار غالب ہیں جمع کر کے شائع کر گئے ہیں۔ اور اِس خدمت سے انہوں نے ادب اردو پر بڑا احسان کیا ہے۔ جو لوگ مفصل حالات دیکھنا چاہیں۔ وہ مولنا حالی کی قابل قدر کتاب کا مطالعہ کریں۔

اِس دیوان کے شروع میں تمہید کے طور پر ذیل کے مختصر حالات اس قادر الکلام شاعر کے درج کئے جاتے ہیں:۔

آپ کا نام مرزا اسد اللہ خاں تھا۔ مگر دہلی میں لوگ انہیں عام طور پر مرزا نوشہ کہتے تھے۔ ان کے بزرگ ایبک قوم کے ترک تھے۔ مرزا صاحب اپنی کتابوں میں لکھتے

ہیں۔ کہ سلجوقی خاندان کی سلطنت کا جب خاتمہ ہوا۔
اور ان کی اولاد اطراف و ممالک میں منتشر ہوگئی۔ تو اس
خاندان کا ایک فرد ترسم خاں نامی نے سمرقند میں بود و باش
اختیار کی۔ مرزا صاحب اس ترسم خاں کی اولاد سے ہیں۔
مرزا صاحب کے دادا ان کے گھرانے کے سب سے
پہلے شخص تھے جو ہندوستان میں آئے۔ مرزا صاحب کے
والد بزرگوار عبداللہ بیگ خان۔ عرف مرزا دولہا۔ کچھ وقت
لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ملازم رہے۔ اور پھر
حیدر آباد گئے اور وہاں سرکار آصفی میں تین سو سوار کے افسر
رہے۔ اس کے بعد آگرہ میں آئے۔ جہاں ان کے خسر عمائد
آگرہ میں سے تھے۔ وہاں سے ریاست الور میں گئے۔ اور
وہیں ایک لڑائی میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔ مرزا صاحب
اپنے ننھیال میں بمقام آگرہ ۱۲۱۲ سنہ ہجری میں پیدا ہوئے۔

سات برس کی عمر میں وہ دِلّی میں آنے جانے لگے۔ کیونکہ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی شادی دِلّی کے ایک معزز خاندان میں ہوئی تھی۔ اور بعد کو خود مرزا صاحب کی شادی اسی خاندان میں مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں ہوئی۔ اور شادی کے بعد سے دہلی میں مقیم ہو گئے۔ اور آخر تہتر برس کی عمر میں سنہ ۱۲۸۵ ہجری مطابق سنہ ۱۸۶۹ء میں دہلی میں ان کا انتقال ہوا اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ میں دفن کئے گئے۔

آگرہ میں انہوں نے ابتدائی تعلیم شیخ معظم نامی ایک مشہور معلم سے پائی تھی۔ اور فارسی زبان میں کوئی دو برس تک انہیں ایک پارسی نژاد شخص سے تلمذ رہا تھا۔ یہ بزرگ پہلے آتش پرست تھے پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ ہرمزد ان کا نام تھا پھر عبد الصمد رکھا گیا۔ مرزا غالب کو ازلی مناسبت زباندانی سے اور خاص کر فارسی زبان سے تھی۔ ایک پارسی نژاد شخص کی صحبت ملنے پر

سہاگہ ہو گئی۔

دہلی کی بود و باش شاعری کے لئے مزید تحریک کا باعث ہوئی۔ اور انہیں ادبی دُنیا میں انتہائے اوج پر پہنچا دیا۔ مرزا صاحب نے تمام عمر مشاغل علمی میں بسر کی۔ ایک پنشن ان کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی خدمات کے عوض میں انہیں دیگر ورثا کے مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے ہمراہ ملی تھی۔ اور کچھ تنخواہ قلعہ سے مقرر تھی۔ یہی دونوں ذریعۂ معاش تھیں۔ غدر کے بعد دونوں مسدود ہو گئیں۔ وہ زمانہ غالب مرحوم پر بہت تنگی کا گزرا۔ مگر غدر کے دو برس بعد نواب رامپور نے سو روپیہ ماہوار ان کے لئے مقرر کر دیا۔ جو مرزا صاحب کے اخیر دم تک جاری رہا۔ اور اس وظیفہ کے مقرر ہوتے کے ایک سال بعد سرکار انگریزی کی طرف سے جو پنشن تھی اور جو غدر کے بعد بند ہو گئی تھی وہ بھی بحال ہو گئی۔

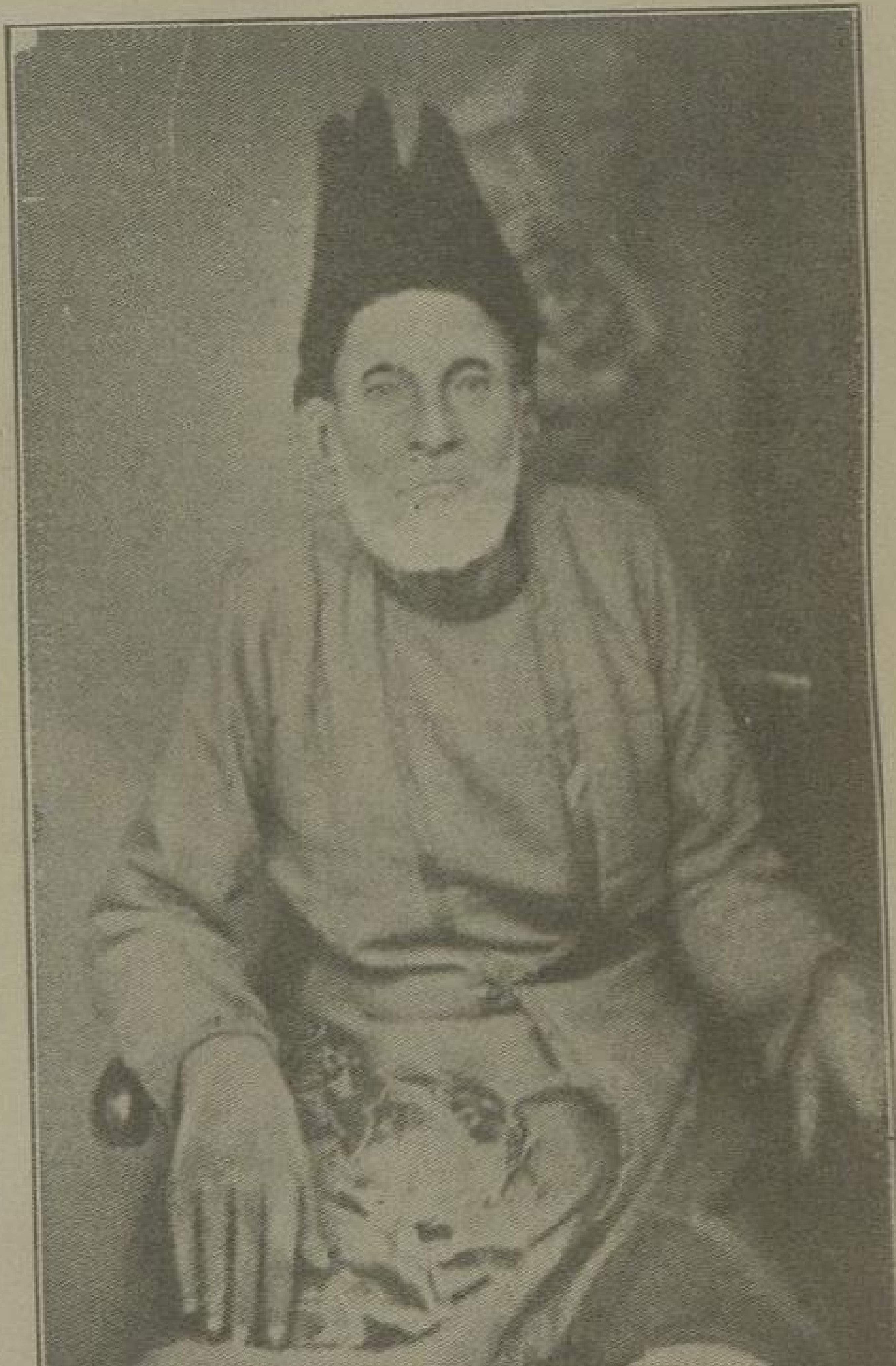
مرزا صاحب کے کلام میں بہت سے گہرے فلسفی خیالات

ملتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب مذہبی اعتبار سے بہت کچھ آزادہ رو اور وسیع الخیال تھے۔ وہ خود اپنا مسلک صلح کل بتاتے ہیں۔ ان کی زندگی اور ان کی تصانیف پر نظر ڈالیں تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کسی خاص فرقۂ اسلام سے مربوط ہونے کے چنداں قائل نہ تھے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ حُبّ اہل بیت ان کے ایمان کا ایک جزو اعظم تھی۔ اور ان کو اگر کچھ میلان تھا تو وہ تشیع کی جانب تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔ ع ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم۔

مرزا صاحب اولاد سے محروم رہے۔ مگر پسران معنوی بیشمار چھوڑ گئے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر تھی۔ اور ایک خاص بات قابل ذکر ان کے متعلق یہ تھی۔ کہ ان میں بہت سے طباع ہندو شاگرد شامل تھے۔ جن کو انہوں نے پورا اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ منشی ہرگوپال تفتہ جو ایک

بڑا مجموعہ فارسی کلام کا چھوڑ گئے ہیں۔ غالب کے ارشد تلاندہ سے ہیں۔ عموماً مرزا تفتہ کہلاتے تھے۔ منشی امراؤ سنگھ صاحب جوہر اردو میں بہت پختہ کلام شاعروں میں ہیں۔ وہ بھی مرزا صاحب کے فیض یافتگانِ خاص میں سے ہیں۔ کیا زمانہ پھر کبھی ایسے منظر دکھائیگا۔ کہ اچھے شاگردوں اور ایسے استاد کے باہمی خلوص کی نظیر دوبارہ قائم ہو۔ اور ملکی لٹریچر کی ترقی میں ہندو مسلمان دوش بدوش کوشاں نظر آئیں؟

عبد القادر



غالب نام آورم نام و نشانم مپرس

هم اسداللهم و هم اسداللهیم ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیوانِ غالب

باب الالف

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے۔ ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی۔ درد لا دوا پایا

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دلِ معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پُرکاری بیخودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہمنے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اسقدر یعنی۔
ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا

آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا

میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں۔ تجکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار

اس چراغاں کا۔ کروں کیا۔ کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل

دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب

تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

بوئے گل نالۂ دل - دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا - سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد

کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

ہے نوآموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند

سخت مشکل ہی کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دلمیں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالب

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا

عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا

اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیفِ نسخہائے وفا کر رہا تھا میں

مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

جراحت تحفہ۔ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسد غمخوارِ جانِ دردمند آیا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہو ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوشِ منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤنگا تماشا - دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہی سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہی اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہی خونِ گرم دہقاں کا
اُگا ہی گھر میں ہر سو سبزہ - ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہی میرے درباں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسّم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیرے مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ، کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یا رب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اُسکی باتیں گو نہ پاؤں اُسکا بھید
پر یہ کیا کم ہی کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھُلا

ہی خیالِ حُسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اک در ہی میری گور کے اندر کھُلا

مونھ نہ کھُلنے پر ہی وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زُلف سے بڑھکر نقاب اُس شوخ کے مُنھ پر کھُلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا

کیوں اندھیری ہی شبِ غم - ہی بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھُلا

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال

نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُسکی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند

واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا

شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام

گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال

یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو

یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو

واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی

جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا

یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا

دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر کو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسانے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئنہ تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھکو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظّارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنّا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا
کی مِرے قتل کے بعد اُسنے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورتخانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائیٔ اندازِ استغنائے حُسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بباد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہینگے حالِ دل اور آپ فرمائینگے کیا

حضرتِ ناصح گر آدیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائینگے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

گر کیا ناصح نے ہمکو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگینگے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دھلی میں رہیں کھائینگے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر اُستوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم‌کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہی شبِ غم بُری بلا ہی
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہی وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہی نشاطِ کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا　　کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں — شکایتہائے رنگیں کا گلا کیا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں — تغافلہائے تمکیں آزما کیا

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے — ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے — تغافلہائے ساقی کا گلا کیا

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے — غمِ آوارگیہائے صبا کیا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اُسکے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ — شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

سُن اے غارتگرِ جنسِ وفا سُن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ — شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں — یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

بلائے جاں ہی غالِب اُسکی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہمسا نہوا
پھر غلط کیا ہی کہ ہمسا کوئی پیدا نہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہوا

سب کو مقبول ہی دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بُتِ آئینہ سیما نہوا

کم نہیں نازشِ ہمتائی چشمِ خوباں
ترا بیمار بُرا کیا ہی گر اچھا نہوا

سینہ کا داغ ہی وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہی وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا
نام کا میرے ہی جو دُکھ کہ کسیکو نہ ملا
کام میں میرے ہی جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا
ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب
حمزہ کا قِصّہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جُزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا
تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑینگے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا

بہ نذرِ کرم تحفہ ہی شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعوی پارسائی کا

نہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا
بہ مہرِ صد نظر ثابت ہی دعوی پارسائی کا

زکواۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

نہ مارا جانکر بیجرم غافل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بیگنہ حق آشنائی کا

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بیزبانی ہی
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا

وہی اک بات ہی جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہی
چمن کا جلوہ باعث ہی مری رنگیں نوائی کا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہی تیری بیوفائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا
بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائیگا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہی آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائیگا

لے تو لوں سوتے میں اُسکے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا

سب کے دل میں ہی جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھپہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائیگا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

باغ میں مجھ کو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خونفشاں ہو جائیگا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائیگا
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

درد منت کش دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو　　اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں　　تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم انکے آنے کی　　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان بھی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

دل اُسکو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے — ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے — مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسد

جفا میں اُس کی ہے انداز کارفرما کا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا — غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا — تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

اہلِ بینش نے بحیرت کدۂ شوخیٔ ناز — جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا — عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

نہ بندھے تشنگیٔ ذوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

تنگیٔ دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

بعد یک عمرِ ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوا جب غم سے یوں بےحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہی
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار
یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جبسے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ
اسقدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اُسکو وفادار اسدؔ
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگیہائے تمنا یعنی ‏ پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل ‏ نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی ‏ کیوں ترا راہگزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ‏ گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں ‏ دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال ‏ دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ‏ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گِلہ
اُس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اُسکو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھکر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

لبِ خشک در تشنگی مُردگاں کا
زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ نا اُمیدی ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جبتک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل آزردگیٔ یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کسقدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو
دل بدل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیاں

جو کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لیکے رہگئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

قاصد کو اپنے ہات سے گردن نہ ماریے
اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

رشک کہتا ہی کہ اُسکا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہی کہ وہ بے مہر کسکا آشنا

ذرّہ ذرّہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہی
گردشِ مجنوں بچشمکہاے لیلا آشنا

شوق ہی ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہی
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا
بنگیا رقیب آخر تھا جو رازدان اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحان اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادہر ہوتا کاشکے مکان اپنا

دے وہ جسقدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالینگے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسبان اپنا

درد دل لکھوں کبتک جاؤں انکو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا
ننگ سجدے سے میرے سنگ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمازی کرلیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہمنے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہی ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صیدِ ز دام جستہ ہی اس دامگاہ کا
رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہی
شرمندگی ہی عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہی
پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

جاں درِ ہوائے یک نگہ گرم ہی آسد
پروانہ ہی وکیل ترے داد خواہ کا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا — کہتے ہیں ہم تجکو منہ دکھلائیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اُسکو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہو کچھ بھی تو دہوکا کھائیں کیا
ہولیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ — یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا
موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نجائے — آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہی
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریٔ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں اس عُقدہ کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدّل بدمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا

ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھُلنا
روتے روتے غم فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہت گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

باب الباء

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مئی بخت رسا رکھتا ہی
سر سے گزرے پہ بھی ہی بالِ ہما موجِ شراب

ہی یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہی اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اُٹھتی ہی طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل موجِ شفق موجِ صبا موجِ شراب

جسقدر روح بناتی ہی جگر تشنۂ ناز
دے ہی تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہی رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہی بال کشا موجِ شراب

موجۂ گُل سے چراغاں ہی گزرگاہِ خیال
ہی تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

نشہ کے پردے میں ہی محوِ تماشای دماغ
بسکہ رکھتی ہی سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ ہستی ہی زہے موسمِ گُل
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہی خوشا موجِ شراب

ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گُل دیکھ آسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

باب التّار

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے عشق خوننابہ مشرب
لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

علی الرغم دشمن شہید وفا ہوں مبارک مبارک سلامت سلامت

نہیں گر سر و برگ ادراکِ معنی تماشائے نیرنگ صورت سلامت

آمد خط سے ہوا ہی سرد جو بازارِ دوست
دودِ شمع کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہی تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ ویراں سازئِ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہی
دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہی میری پرسش اُسکے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہی اُسکی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہی پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہی وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چُپکے چُپکے مجھکو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنسکے کرتا ہی بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ ز بس تکرارِ دوست

باب الجیم

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہی آج

باب جیم فارسی

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئنہ سے جوہر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل
کیا ہی کسنے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہی بہ حسرت نظارۂ نرگس
بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہی صہبائے آتشِ پنہاں
بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

باب دالِ مہملہ

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

در خورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہی سُرمے سے خفا میرے بعد

ہی جنوں اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہی گریباں سے جُدا میرے بعد

کون ہوتا ہی حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہی مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دُنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہی بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

باب رار مہملہ

بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار
نہیں ہی سایہ کہ سُنکر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار
ہوئی ہی کسقدر ارزانیٔ مئی جلوہ
کہ مست ہی ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ پوچھ بیخودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانیگا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

کام اُس سے آپڑا ہے کہ جسکا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑونگا میں نہ اُس بت کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دُونا ہو التفات
سُنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب نکر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُنپر کہے بغیر

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھکر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھکر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں تمکو بے سبب آزار دیکھکر

آتا ہی میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اُسکے ہات میں تلوار دیکھکر

ثابت ہوا ہی گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہی موجِ می تری رفتار دیکھکر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہات
ہم کو حریصِ لذّتِ دیدار دیکھکر
بکجاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھکر
زُنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہی راہ کو پُرخار دیکھکر
کیا بدگماں ہی مجھسے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھکر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پشتِ چشم سے جسکے نہووے مُہر عنواں پر

مجھے اب دیکھکر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اِک ہوائے تند ہی خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُسنے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہی گریباں پر

ہیں بسکہ ہر اک اُنکے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُنکو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہی کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند
ہی تیر مقرر مگر اُس کی ہی کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھینگے
لے آئینگے بازار سے جاکر دل و جاں اور

ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

ہی خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہانتاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہی میری گردن پر

برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہی بالِ یک تپیدن پر

فلک سے ہمکو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہی
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہی
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہی اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہی موقوف گلخن پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسیگا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں۔ اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملینگے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اہیِ فلکِ پیرِ جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور
تم کون سے ایسے تھے کھرے داد ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہر حال یہ مدّت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

نا داں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

باب زائے معجمہ

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر
ہے داغ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز
ہے نازِ مفلسانِ زر از دست رفتہ پر
ہوں گُل فروش شوخیٔ داغِ کہن ہنوز
میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیداد فن ہنوز

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

ہر ایک ذرّۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالب
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

کیونکر اُس بت سے رکھوں جان عزیز — کیا نہیں ہی مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے — ہی ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہی اور جان عزیز

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرایشِ خمِ کاکل — میں اور اندیشہ ہاے دور و دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی — ہم ہیں اور راز ہاے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد — ورنہ باقی ہی طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے — ناز کھینچوں بجاے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں — جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز — اے ترا ظلم سر بسر انداز
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو — ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا — میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا — اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

بابِ سین مہملہ

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار تسلّی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گُل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اُسکا وہ آکر تری دیوار کے پاس

باب شین معجمہ

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلِّ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

باب عین مہملہ

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع
ہوئی ہے آتشِ گُل آبِ زندگانیٔ شمع

زبانِ اہلِ زباں میں ہی مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیٔ شمع

کرے ہی صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام
بطرزِ اہلِ فنا ہی فسانہ خوانیٔ شمع

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہی اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہی ناتوانیٔ شمع

ترے خیال سے روح اہتراز کرتی ہی
بجلوہ ریزیٔ باد و بپرفشانیٔ شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہی شہیدِ گلِ خزانیٔ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

باب الفاء

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اکبار جل گئے
اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

باب کاف تازی

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہی سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہی جہاں میں کسقدر پیدا نمک

مجکو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہوجیو
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گُل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کسکا کہ آج
گردِ ساحل ہی بزخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہی مرے زخمِ جگر کی واہ واہ
یاد کرتا ہی مجھے دیکھے ہی وہ جسجا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہی
دل طلب کرتا ہی زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توقیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل ہی سر تا پا نمک

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہی تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہی حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہی قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائینگے ہم تم کو خبر ہوتے تک

پرتوِ خور سے ہی شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہوتے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہی اِک رقصِ شرر ہوتے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہی سحر ہوتے تک

باب کاف فارسی

گر تجھ کو ہی یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

آتا ہی داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

باب اللام

ہی کسقدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل
خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گُل
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے نفَسِ عطر سائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آجتک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جسکا خیال ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

باب المیم

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یکنفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیرائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

مجکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا
رکھ لیجو میرے دعوئ وارستگی کی شرم

باب النون

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خط و خال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کی وفا ہم سے تو غیر اسکو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں
دلمیں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مِہر گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے اُس سے کوئی گھبرائیگا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھئے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہی گریباں تنگ پیراہن جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اوڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اُسکے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہی
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہی عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہی گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لیگئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی آسائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سُرمہ سا کہوں

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہی
بات کچھ سر تو نہیں ہی کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہی ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ہم سے کھُل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑینگے رکھکر عذرِ مستی ایک دن

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہی پستی ایکدن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیئے
بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہی وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس مُنہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہی اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہی اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہی
ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہی
لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

ہی ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہی عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہی تری سر نوشت میں
گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

جاں ہی بہائے بوسہ و لے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہی کہ وہ نیمجاں نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہی مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

شوق اس دشت میں دوڑائے ہی مجھکو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا جُز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہی جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

سُراغِ تفِ نالہ داغِ دل ہے
کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

یا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہی
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

تیوری چڑھی ہوئی ہی جو اندر نقاب کے
ہی اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نپائے
جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں کام نہ آے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہات باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ ترے رہ گزر کو میں

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہی خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مقدر ہی جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہی عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہی پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہے
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حُجّت ہے کہ مشہور نہیں

نالہ جز حُسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

اے محرمیٔ تسلیم و بدا حالِ وفا

جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

نگِ تمکینِ گُل و لالہ پریشاں کیوں ہے

گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں

سبدِ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں

مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا

دی ہے جائے دہن اسکو دمِ ایجاد نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت

یہی نقشہ ہے و لے اسقدر آباد نہیں

کرتے کس منھ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہی
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اُسکے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہر طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

ہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

وئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

اؤں سامنے اُنکے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

ھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہی ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم اُنکے وعدے کا ذکر اُنسے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

ترے توسن کو صبا باندھتے ہیں — ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہی — ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تری سُرعت کے مقابل ای عمر — برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم — اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہی واشدِ گل — مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطیہائے مضامیں مت پوچھ — لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں   آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پرکار ہیں خوباں غالب   ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدمبوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہمکو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُنکے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہی زلیخا خوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہی شامِ فراق
میں یہ سمجھونگا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

نیند اُس کی ہی دماغ اُسکا ہی راتیں اُسکی ہیں
تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا
بلبلیں سُنکر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

بسکہ روکا میںنے اور سینہ میں اُبھریں پے بپے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جانفزا ہی بادہ جس کے ہات میں جام آگیا
سب لکیریں ہات کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزای ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہی رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو ای اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

دیوانگی سے دوش پہ زنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہات سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دلمیں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہائے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہات میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

نہیں ہی زخم کوئی بخیہ کے درخور مرے تن میں
ہوا ہی تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں

ہوئی ہی مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہی برنگِ پنبہ روزن میں

ودیعت خانۂ بیداد کاوشہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہی مرے ہر قطرۂ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو تو رکھدیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش مانعِ بے ربطیٔ شورِ جنوں آئی
ہوا ہی خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے

پر افشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرّہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے

جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو

سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرۂ خوں تن میں

اسد زندانیِ تاثیرِ الفتہائے خوباں ہوں

خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں

سوائے خونِ جگر۔ سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اُڑا لیجائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گُل رہگزر میں خاک نہیں

بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں مے کش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دلگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئینگے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منھ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جسکو ہو دین و دل عزیز اُسکی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منھ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اُسکے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیئے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اُسکے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے
اُسکی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُنکے ستم ظریف نے مجکو اُٹھا دیا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کسطرح
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بنگئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

باب الواو

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِّ صحبتِ اہلِ کنشت کو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہی قط قلمِ سرنوشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہی دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہو

ہی مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہو

پیدا ہوئی ہی کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہو

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونئ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر، نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہی نوا سنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں نہو یہ رشک کیا کم ہی
نہ دی ہوتی خدا یا آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیرے اک آنسو اُس جراحت پر
کیا سینے میں جسنے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا یہ رجا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھکو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بیخبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویاں ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو
مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیمتن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانْو
اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ملتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانْو
ہے جوشِ گُل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانْو
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پانْو
غالب مرے کلام میں کیونکر مزا نہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانْو

واں پہنچکر جو غش آتا پئے ہم ہی ہم کو

صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہی ہم کو

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہی

کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہی ہم کو

ضعف سے نقشِ پئے مور ہی طوقِ گردن

ترے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہی ہم کو

جانکر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو

یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہی ہم کو

رشکِ ہمطرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں

نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہی ہم کو

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہی ہم کو

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار
پاسِ بے رونقیٔ دیدۂ نم ہی ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہی ہم کو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہی ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہی یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہی ہم کو

لیے جاتی ہی کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کافِ کرم ہی ہم کو

تم جانو تمکو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہی تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

اُبھرا ہوا نقاب میں ہی اُنکے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ادب ہی اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہی اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمیں پھر اُنسے اُمید اور اُنھیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلّی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

بتاؤ اُس مژہ کو دیکھکر کہ مجکو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بنکے کیا پوچھیں کہ ہمسے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہی جسپہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دلمیں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہی جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کسکا ہی
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اُسکا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

رہیے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہو اور پاسباں کوئی نہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہو بیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہو

باب ہا ہوز

ہی سبزہ زار ہر در و دیوار غمکدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اُسکی خزاں نپوچھ

ناچار بیکسی کی بھی حسرت اُٹھایئے
دشواری رہ و ستم ہمرہاں نپوچھ

باب الیاء

صد جلوہ روبرو ہی جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

ہی سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منّتِ طفلاں اُٹھائیے

دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہی خم
اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اُٹھائیے

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے

بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر

آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی

ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیئے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بیخودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

یعنی بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقئ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدح وجہ پریشانیٔ صہبا
یکبار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

کھلیگا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
قسم کھائی ہی اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

لپیٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہی
ولے مشکل ہی حکمت دلمیں سوزِ غم چھپانے کی

اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو۔ دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

لکدکوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اُٹھانے کی

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اُسنے جس سے ہمنے کی تھی بارہا نیکی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

کی اُسنے گرمِ سینۂ اہلِ ہوس میں جا
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہی

کیا خوب تمنے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی مُونھ میں زبان ہی

بیٹھا ہی جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہی

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہی

ہی بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالب ہم اسمیں خوش ہیں کہ نامہرباں ہی

۱ درد سے میرے ہی تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دلمیں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے

گلفشانیہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہی تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہی اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت ملگئی
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

ہات ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشگال
ہی نظر خو کردہ اختر شماری ہائے ہائے

گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال
ایک دل تِس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک
ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اُسکے پاس دلِ حق شناس ہے

پی جسقدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
رحمت کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا
ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہی وہی بد مستیٔ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ
جسکے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہی

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی اندنوں بیزار ہی

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہی کہ تا
تجھ پہ کھُلجاوے کہ اسکو حسرت دیدار ہی

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہی
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہی

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کسکو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہی اور ماتم بال و پر کا ہی

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کسنے دیکھا ہے

نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام — دلکے خوں کرنکی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ہی آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہی خندۂ دنداں نما مجھے

ڈھونڈھے ہی اُس مغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طی کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

کرتا ہی بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہی نکہتِ گُل سے حیا مجھے

کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجّادہ رہن مے
مدّت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں
بھُولے سے اُسنے سیکڑوں وعدے وفا کیے

غالب تمھیں کہو کہ ملیگا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے
بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

جادادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حُسن کا
جوشِ بہار جلوہ کو جس کے نقاب ہے

میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسد مسرّتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے
گر حیا بھی اُسکو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سُنکر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اُسکے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جسقدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

سادگی پر اُسکے مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُسنے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں ملجائیگی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بیحاصل میں ہے

رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی سے عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اپنی گلی میں مجکو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جسقدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تمکو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہمنے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُنکی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دیکے خط مونھ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس مُنھ سے جاؤگے غالب
شرم تمکو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی مُنھ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ‏ ابر کیا چیز ہی ہوا کیا ہی
ہمکو اُنسے وفا کی ہی امید ‏ جو نہیں جانتے وفا کیا ہی
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا ‏ اور درویش کی صدا کیا ہی
جان تمپر نثار کرتا ہوں ‏ میں نہیں جانتا دعا کیا ہی

میںنے مانا کہ کچھ نہیں **غالب**
مفت ہات آئے تو برا کیا ہی

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے
ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہی صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مرے آتا نہیں گو آئے

ظاہر ہی کہ گھبرا کے نہ بھاگینگے نکیرین
ہاں مُنہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کی ہمنفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجکو ڈبو آئے

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم دلّالِ جنسِ رسوائی — دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہی صد گونہ اشکباری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بیقراری ہے

جلوہ پھر عرضِ نازکرتا ہے ‏ ‏ روز بازارِ جاں سپاری ہے

پھر اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں ‏ ‏ پھر وہی زندگی ہماری ہے

قطعہ

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز ‏ ‏ گرم بازارِ فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر ‏ ‏ زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال ‏ ‏ ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب ‏ ‏ اشکباری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا ‏ ‏ آج پھر اُس کی روبکاری ہے

بیخودی بے سبب نہیں غالب

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

کروں بیدادِ ذوقِ پر فشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اُسکے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہم ہوئے اُتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں

ہر چند اس میں ہات ہمارے قلم ہوئے

اللہ ری تیری تندیِٔ خو جسکے بیم سے

اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق

جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے

جو واں نہ کھچ سکے سو یہاں آکے دم ہوئے

چھوڑی اسد نہ ہم نے گدائی میں دل لگی

سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہی
اک شمع ہی دلیلِ سحر سو خموش ہی

نے مژدۂ وصال۔ نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہی

مے نے کیا ہی حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہی

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہی

دیدار بادہ۔ حوصلہ ساقی۔ نگاہ مست
بزمِ خیال میکدۂ بیخروش ہی

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سُنو جو گوش نصیحت نیوش ہے نا نصیحت

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ۔ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کے غبار نہیں ہے

دل سے اُٹھا لطف جلوہ ہائے معانی غیرِ گُل آئینۂ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے وائے اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجکو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

پابدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کیوقت
ہی نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہی یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے
جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اِس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

تب بارِ گرانمائیگیٔ اشک بجا ہی
جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اُس چشمِ فسونگر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

غارتگرِ ناموس نہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہی دلِ نالاں
جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتشکدہ ہی سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

حسنِ مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہی
اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہی

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

خار خار الم حسرت دیدار تو ہے
شوق گلچین گلستان تسلّی نہ سہی

مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

نفسِ قیس کی ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستایش کی تمنّا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے
تمھارے آئیو اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے

قسم جنازہ پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پر ہوں میں شکوہ سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سُست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہ کواکب سپہ مہر علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلخوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہی
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہی

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہی

یہ رشک ہی کہ وہ ہوتا ہی ہم سخن تمسے
وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہی

چپک رہا ہی بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہی

جلا ہی جسم جہاں دل بھی جلگیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہی

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جسکے لیے ہمکو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لیے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھینگے گرچہ مطلب کچھ نہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

دلکو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمھارے دام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہِ دیندار نے شفا پائی

کب وہ سنتا ہی کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روینگے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہی نشانی میری

متقابل ہی مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہی گرانی میری

گرد بادِ رہِ بیتابی ہوں
صرصرِ شوق ہی بانی میری

دہن اسکا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
ننگِ پیری ہی جوانی میری

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

دشنہ نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے — یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر — جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل — بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل — کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیئے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو — کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی — یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

غافل ان مہ طلعتوں کیواسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا بتغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بیخودی بستۂ تمہیدِ فراغت ہو جو

پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھسے

شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے

ہو نگہ مثلِ گُلِ شمع پریشاں مجھسے

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے

سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھسے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھسے

آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھسے

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ

ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھسے

نکتہ چیں ہی غمِ دل اُسکو سُنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اُسکو مگر اے جذبۂ دل

اُسپہ بنجائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہی کہیں چھوڑ نہ دے بھول نجائے

کاش یوں بھی ہو کہ بِن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہی لیے یوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہی تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا

ہات آویں تو اُنھیں ہات لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے

پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے

تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے

صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے

جلوہ کا تیرے وہ عالم ہی کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارتگاہِ حیرانی کرے

ہی شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہی زلف کو اُلفت نے عہد
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہمکو
نہ دے جو بوسہ تو مُنہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہمسے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہات پاؤں پھول گئے
کہا جو اُسنے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے مرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العینِ دامن ہی
دلِ بیدست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہی

بہ طوفانگاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہی

ابھی آتی ہی بو بالش سے اُسکی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہی

خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئی ہو
فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہی

کہوں کیا دلکی کیا حالت ہی ہجرِ یار میں غالب
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہی

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

ہرچند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے

شادی سے گزر کہ غم نہووے
اُردی جو نہو تو دَی نہیں ہے

کیوں ردِّ قدح کرے ہے زاہد
مَے ہے یہ مگس کی قَے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

در پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

یہ باعثِ نومیدیٔ اربابِ ہوس ہے
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

اسدؔ ہی نزع میں چل بے وفا برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہی

کیوں نہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہو
یعنی اس بیمار کو نظّارہ سے پرہیز ہی

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائیگی
وائے ناکامی کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہی

عارضِ گُل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہی

دیا ہی دل اگر اُسکو بشر ہی کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہی کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے

قضا سے شکوہ ہمیں کسقدر ہی کیا کہیے

رہے ہی یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب

اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہی کیا کہیے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہی ہمکو فریب

کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہی کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال

کہ یہ کہے کہ سر رہگزر ہی کیا کہیے

تمھیں نہیں ہی سر رشتۂ وفا کا خیال

ہمارے ہات میں کچھ ہی مگر ہی کیا کہیے

انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیئے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے
حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے
کہا کسی نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن
سوائے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

دیکھکر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کرگئی وابستۂ تن میری عُریانی مجھے
بن گیا تیغ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

کیوں نہو بے التفاتی اُس کی خاطر جمع ہی
جانتا ہی محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

میرے غمخانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھدیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہی وہ کافر۔ نہوتا کاشکے
اسقدر ذوقِ نوائے مرغِ بُستانی مجھے

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لیگیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہی
تمنے کیوں سونپی ہی میرے گھر کی دربانی مجھے

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ

پھر ہوا ہی تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی

میرزا یوسف ہی غالب یوسفِ ثانی مجھے

یاد ہی شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے

سبحۂ زاہد ہوا ہی خندۂ زیرِ لب مجھے

ہی کشادہ خاطرِ وابستہ در رہنِ سخن

تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے

رشک آسایش پہ ہی زندانیونکی اب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذتہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے
دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے
قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہکن کے حوصلہ کا امتحاں آخر
ہنوز اُس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمایش ہے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمایش ہے

رہے دل ہی میں ہی تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمایش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمایش ہے

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمایش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو

ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہے

وہ آوینگے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب

نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمایش ہے

کبھی نیکی بھی اُسکے جی میں گر آجائے ہے مجھسے

جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے

کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی

عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے۔ ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے نااُمیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف نظّارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدّعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے

کشاد و بستِ مژہ سیلئِ ندامت ہے

نہ جانوں کیونکہ سے داغِ طعنِ بدعہدی

تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

بہ پیچ و تاب ہوس سلکِ عافیت مت توڑ

نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا مقابل و دعویِ عشق بے بنیاد

جنون ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے

میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اُسکو دیکھکر آجائے رحم
وہاں تلک کوئی کسی حیلہ سے پہنچا دے مجھے

منہ نہ دکھلائے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بنجاؤں تو شانہ میں اُلجھا دے مجھے

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سُلیماں مرے نزدیک
اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے
پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شب ہجراں کی تمنّا مرے آگے

ہے موج زن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہئے
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہئے

نہ کہیئو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہئے
جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنیئے
جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہئے
کہیں حقیقتِ جانکاہیٔ مرض لکھیئے
کہیں مصیبتِ ناسازیٔ دوا کہئے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہئے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیٔ روشں و مستیٔ ادا کہیئے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیئے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
صرف بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جسکو دیکھ کے غمناک ہو گئے

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے
دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گُل
یکجہاں زانو تأمل در قفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کبتک خیالِ طرّۂ لیلےٰ کرے کوئی

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات
ہاں دردبنکے دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دِل وا کرے کوئی

چاکِ جگر سے جب رہ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخ گُل
تا چند باغبانئ صحرا کرے کوئی

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجادِ یاس خیز
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھکو غم کیا ہے

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہمکو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

جوہرِ تیغ پہ سرِ چشمۂ دیگر معلوم

ہوں میں وہ سبزہ کہ زہر آب اُگاتا ہے مجھے

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے

آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک

آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے

دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اُسکی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نِکلنا خلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں لیکن
بُہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھلجائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اُس طُرّہ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُسکو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

ہوئی اس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا

اُسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ

پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ہستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے

موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے

جُز زخمِ تیغِ ناز نہیں دِل میں آرزو

جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

تکلف برطرف ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز تیغِ تیزِ عریاں ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھکو بدتر از چاکِ گریباں ہے

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے

ہم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجان ہے

خموشیوں میں تماشہ ادا نکلتی ہے
نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

ہے ذرّہ ذرّہ تنگئ جا سے غبارِ شوق
گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے

دل مدّعی و دیدہ بنا مدّعا علیہ
نظّارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب
اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

پچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گزر نہ کر

ہر ذرّہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں

طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی

اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہِ سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالئے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہارِ پنبۂ مینا کہیں جسے

غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی زِ ادا ہے
داغِ دلِ بیدرد نظر گاہِ حیا ہے

دِل خون شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بت بدستِ حنا ہے

شعلہ سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیٔ دِل پہ جلا ہے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بانداز گل آغوش کشا ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

معلوم ہُوا حالِ شہیدانِ گذشتہ
تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

منظور تھی یہ شکل تجلّے کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ کے ظہور کی
اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی
واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا
گویا ابھی سُنی نہیں آواز صُور کی
آمد بہار کی ہے جو بُلبُل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیُور کی
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے اِن بُتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اِس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کرونگا حضور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے
کہتے ہُوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیّاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ اُن کو
انکار نہیں اور مجھے اِبرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مُدت ہُوئی ہے یار کو مہماں کئے ہُوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہُوئے

کرتا ہُوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہُوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہُوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہُوئے ہیں چاک گریباں کئے ہُوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مُدت ہُوئی ہے سیر چراغاں کئے ہُوئے

پھر پُرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہُوئے

پھر پھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظّارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بارِ منّتِ درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن

بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے

بیٹھے ہیں ہم تہیّۂ طوفاں کئے ہوئے

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے

رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے

رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کیلئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناسِ خلق اے خضر

نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کیلئے

فلک نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیٔ قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے
نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملّت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کی آستاں کے لئے
زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرائش
بنینگے اور ستارے اب آسماں کے لئے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

قصائد

سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار
ہستیٔ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار
سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

مستئ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بُلبُل
راہِ خوابیدہ ہُوئے خندۂ گُل سے بیدار

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سر نوشتِ دو جہاں ابر بیک سطرِ غبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن تو باندازِ ہلال
قوّتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

میکدے میں ہو اگر آرزوئے گُل چینی
بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار
موجِ گُل ڈھونڈھ نہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار
کھینچے گر مانئ اندیشۂ چمن کی تصویر
سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار
لعلِ سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطئ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلکُ العرش ہجومِ غمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمّتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفاں
چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

ذرّہ اُس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ ہستیٔ ناز
عرضِ خمیازہ ایجاد ہے ہر موجِ بہار

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوہ کے تیرے بہوائے دیدار
تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو مژہ گوہر بار

ہم عبادت کو ترے نقش سے ہے مہر نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استظہار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبیؐ
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار
جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگاں دوگر سوئے غم خار
مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ
خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمنِ آلِ نبی کو بہ طرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

قصیدہ

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں
بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا چہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکیں

عشقِ بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگارِ رُخِ آئینۂ حُسنِ یقیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طربگاہِ رقیب
بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز
کس نے پایا اثرِ نالہ دلہائے حزیں

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علیؑ عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل
قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقیں

ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرم خرام
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویر زمیں
جلوہ پرواز ہو نقشِ قدم اُسکا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی زمیں
نسبتِ نام سے اُسکی ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں
فیض خلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گُل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
برشِ تیغ کا اُسکی ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اُسکا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے

رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں

جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا

وصی ختم رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں

جسم اطہر کو ترے دوش پیمبر منبر

نام نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب

شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہر آئینۂ سنگ

رقم بندگی حضرت جبرئیل امیں

تیرے در کے لئے اسباب نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دیں
تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوح خدا
کس سے ہو سکتی ہے آرائش فردوس بریں
جنس بازار معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخی عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے ترے حوصلۂ فضل پر از بسکہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسن و قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمین
غمِ شبیّر سے، ہو سینہ یہانتک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمئ شوق
کہ جہانتک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ اُلفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

قصیدہ

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص
حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اُسکو بھولا نہ چاہیئے کہنا
صُبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور تیرا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
ماہ بن ماہتاب بن میں کون
مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام
میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام
جو کہ بخشیگا تجھکو فرِّ فروغ
کیا نہ دیگا مجھے مئے گلفام

جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکی قطع تیری تیزئ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوئے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

مے ہی پھر کیوں نہ میں پئے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہے زیست حرام

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

کعبہ میں جا بجائینگے ناقوس
اب تو باندھا ہے دَیر میں احرام

اس قدح کا ہے دور مجھکو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام

بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار
دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام
چھیڑتا ہوں کہ اُنکو غصّہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام
کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
نامِ شاہنشاہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذوالجلالِ والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف
نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنئ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اوستادِ رستم و سام
اے ترا لطفِ زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام

چشم بد دور خسروانہ شکوہ

لوحش اللہ عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم

جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے

ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے

گیو و گودرز و بیژن و رُہام

مرحبا موشگافیٔ ناوک

آفریں آبدارئ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

رعد کا کر رہی کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

فنِ صورت گری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اُس کے مضروب کے سر و تن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام

جب ازل میں رقم پذیر ہُوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور اُن اوراق میں بکلکِ قضا
مجملاً مندرج ہُوئے احکام
لِکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش
لِکھدیا عاشقوں کو دشمن کام
آسمان کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام
تیرے توقیعِ سلطنت کو بھی
دے بدستورِ صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اِس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیٔ آغاز
ہو ابد تک رسائیٔ انجام

قصیدہ

صبحدم دروازۂ خاور کھُلا
مہرِ عالم تاب کا منظر کھُلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھُلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھُلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھُلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھُلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھُلا
تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھُلا
لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے
رکھدیا ہے ایک جامِ زر کھُلا
بزمِ سُلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھُلا

تاج زرّیں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے مُنہ پر کُھلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اس پہ سر تا سر کُھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین ہیں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کُھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کُھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کُھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھُلا
توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھُلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب
تو کہے بتخانۂ آذر کھلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کی
منصبِ مہر و مہ و محور کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک
میری حدِّ وسع سے باھر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پَر کھُلا
کاشکے ہوتا قفس کا در کھُلا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پاویں گر کھلا

ہمکو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کمان
کب کمر سے غمزہ کے خنجر کھلا

مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

نامہ کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

خامہ نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں بھی اُٹھتے ہی لنگر کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں عرض سے رُتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب علوِ پایۂ منبر کھلا
سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس
اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ
اب مآلِ سعیٔ اسکندر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

ہو سکے کیا مدح ہاں ایک نام ہے
دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا

فکر اچھی پر ستایش نا تمام
عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا

جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل
تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

در صفتِ انبہ

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامے کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

آم کا کون مردِ میداں ہے
ثمرو شاخ گوئے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں
آئے یہ گوئے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جائے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گُل اُس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
جب خزاں آئے تب ہو اُس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن باوجود غمگینی
جان دینے میں اُس کو یکتا جان
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بحکم رب النّاس
بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنج زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر یکبار
پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم
نازپروردۂ بہار ہے آم

خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والئ ولایتِ عہد
عدل سے اُسکے ہے حمایتِ عہد

فخرِ دیں عزِّ شان جاہ و جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا ہُما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایۂ ہے

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نُور
جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادماں رکھیو
اور غالب پہ مہرباں رکھیو

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظر و بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل
پانو سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل
ترا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام
تری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبرئیل
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
بسخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بکرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توقیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل
تیری دانش مری اصلاح مفاسد کی رہیں
تیری بخشش مرے انجاح مقاصد کی کفیل
ترا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید
ترا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھکو اماں
چرخِ کجباز نے چاہا کہ کرے مجھکو ذلیل

پیچھے ڈالے ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکے ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
دُرِّ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل
فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
مرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
مرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

ایضاً

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ اُنکی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ اُنکا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

در مدح ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے
خامہ انگشت بدندان کہ اِسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیئے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیئے
مِسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیئے
داغِ ظرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیئے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیئے
سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیئے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلا کہیئے
حجرالاسود دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیئے

وضع میں اُس کو اگر سمجھئے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہئیے

صومعہ میں اِسے ٹھیرائیے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اِسے خشتِ خُمِ صہبا کہئیے

کیوں اِسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیئے
کیوں اِسے نقطۂ پرکارِ تمنّا کہئیے

کیوں اِسے گوہرِ نایابِ تصوّر لکھیئے
کیوں اِسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہئیے

کیوں اِسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیئے
کیوں اِسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہئیے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجئے فرض
اور اس چکنی سُپاری کو سویدا کہیئے

قطعہ

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

بیانِ مصنّف

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سَو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفرؔ کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اُس سے قطعِ محبّت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونق بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ گرجی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست
نسبت اک گونہ مرے دلکو تری ہات سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں
یہ دعا شام و سحر قاضیٔ حاجات سے ہے

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھکو ملاقات سے ہے

اِسکے گذرے نہ گماں ریو ریا کا زنہار
غالب خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر چلو
رکھدیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند
بنتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

در مدح شاہ

اے شاہِ جہانگیر جہان بخش جہاندار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اُس عقدے کو سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مریدی تیرا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت
تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے شکایت میں تری میری عبارت
نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت
تجھکو شرفِ مہرِ جہانتاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت
افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانیکو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

گذارشِ مصنف بحضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتابِ آثار
تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہُوئی میری وہ گرمیِٔ بازار
کہ ہُوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ ازروئے ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اِتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے ابکے سال
کچھ بنایا نہیں ہے ابکی بار

رات کو آگ اور دِن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک اِنساں
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار
میری تنخواہ جو مقرر ہے
اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اِسی چلن پہ مدار

مجھکو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے و خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنیئے
ہے زباں میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعات

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہُوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

قطعہ

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی
مجھپہ کیا گذریگی اتنے روز بن حاضر ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

قطعۂ تاریخ

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر
کہ جسکے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب
نہ کیوں ہو مادۂ سال عیسوی محظوظ
۱۸۵۴

قطعۂ تاریخ دیگر

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اُسکی کیا ہے
تو بولا "انشراحِ جشنِ جمشید"
۱۲۷۳ ہجری

قطعہ ۵

گو ایک بادشاہ سب خانہ زاد ہیں
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں

کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعیات

بعد از اتمام بزم عیدِ اطفال
ایام جوانی رہے ساغر کشِ حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گذشتہ یک قدم استقبال

ایضاً

شب زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا

رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پرنم تھا

ایضاً

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

ایضاً

دِل تھا کہ جو جان دردِ تمہید سہی
بیتابیٔ رشک و حسرتِ دید سہی

ہم اور فسردن اے تجلی افسوس
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

رباعی

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

ایضاً

دِل سخت نژند ہو گیا ہے گویا
اِس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا

پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالبؔ منہ بند ہو گیا ہے. گویا

ایضاً

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ
دِل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

ایضاً

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ایضاً

بھیجی ہے جو مجھکو شاہ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ایضاً

ہیں شہ میں صفات ذوالجلالی باہم
آثار جلالی و جمالی باہم

رباعی

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہِ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

ایضاً

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

رباعی

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرستش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

ایضاً

ہم گرچہ بنے سلام کرنیوالے
کرتے ہیں درنگ کام کرنیوالے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح وشام کرنے والے

رباعی

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ میرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خسخانہ و برفاب آب کہاں سے لاؤں

ایضاً

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

متفرقات

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مرے بالیں پہ اسے پھر کس وقت

صفائی حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائیگا تجھ سا رقیب آخر

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک
گذرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

بہ نالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

لوں دام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

برشگالِ گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیئے
کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن
الفتِ گل سے غلط۔ ہے دعوئے وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

دونو جہان دیکے وہ سمجھے کہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہل بزم
ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اسکو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

دلِ نازک پہ اسکے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اُس کافر کو الفت آزمانے میں

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو
بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو
اگر وہ سرو قد گرمِ خرامِ ناز آ جائے
کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

واں اسکو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

تا کہ ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالب ترا احوال سُنا دینگے ہم ان کو
وہ سن کے بُلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

پنس میں گزرتے ہیں جو وہ کوچہ سے میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتنہا برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

اُگ رہا ہے درودیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذّت زندگانی کی
کشاکشہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی
پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی
جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اس سے کیا توقع بزمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی میری کہانی

یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا
کہ میرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

تغافل دوست ہوں میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے

نقشِ نازبتِ طنّاز بآغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے
وہ تبِ عشقِ تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گُل ہونا آغوش کشائی ہے
واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اور اُلٹا دعوٰے رسائی ہے

از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

سیماب پشت گرمیِ آئینہ دے ہے ہم
حیراں کئے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے
آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں
معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیئے

اس لب سے مِل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جراتِ رندانہ چاہیئے

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہو جائے
غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے
سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالب
اگر گل سرو کی قامت پہ پیراہن نہو جائے

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا۔
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن
چشمِ وا گر دیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگذار کی
جب اُسکے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

ہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلف اے شرار جستہ کیا ہو جائیے
مہ آساننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائے

ہستی کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خواب سنگیں ہے

سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

تمت